میرے خواب ادھورے ہیں
شہناز مزمّل

شہناز مزمل اب معروف شاعرہ ہے۔ اس کے شعری مجموعوں کی بارِدگر اشاعت اس کی پزیرائی پر دال ہے۔ اس کے ہاں تخلیق کا تار و پود پاکیزگی' حبّ الوطنی اور محبت سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے ہاں موضوعات سنجیدگی اور تازگی سے سرشار ہیں۔ وہ عصری شعور کو روحانیت کے آئینے میں دیکھتی ہے اور ہر قسم کی مصلحت سے بے نیاز اپنا مافی الضمیر بیان کر دیتی ہے۔

سعد اللہ شاہ

اگست 1997ء

میرے خواب اُدھورے ہیں

شہناز مزمّل

بار اول : نومبر ۱۹۹۵ء

بار دوئم : اکتوبر ۱۹۹۷ء

سرورق : تنویر مرشد

انتساب

عظمتوں اور تقدس کے نام

851

SHA - A Shahnaz Muzammil

Adhorre Khawab (Unfulfilled Dreams)

Shahnaz Muzammil __

۸۵۱

ش ہ ن -- الف شہناز مزمل

ادھورے خواب / شہناز مزمل

فہرست

غزلیں

دھوپ کی چادر اوڑھ کے سر پر چلتی ہوں
اپنی آگ میں تنہا خود ہی جلتی ہوں

آوازوں کے بوجھ کی گٹھڑی لاد کے میں
چپ کے زینے خاموشی سے چڑھتی ہوں

ادھورے خواب

خواب اگر ادھورے رہ جائیں تو ان کی کڑیاں باوجود کوشش کے جڑ نہیں پاتیں۔ میں بھی 1989ء سے اپنے ادھورے خواب سمیٹنے اور ان کی کڑیاں جوڑنے کے عمل میں مصروف ہوں یہ جستجو کبھی "پیام نو" کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور کبھی جذبے حرف پہن کر "جذب و حروف" میں ڈھل جاتے ہیں اور یوں "جرات اظہار" کا قرینہ بھی آجاتا ہے۔ جستجو کا یہ عمل جاری رہتا ہے ادھورے خواب دھندلے دھندلے عکس ذہن پہ بناتے رہتے ہیں اور "عکس دیوار پہ تصویر بن جاتی ہے۔" کڑیاں پھر بھی جڑ نہیں پاتیں نہ تو ادھورے خواب پایہ تکمیل کو پہنچتے ہیں اور نہ ہی نئی تعبیر کو عنوان ملتا ہے۔ جستجو کا یہ سفر آبلہ پا کو وادی پرخار کی سیر تو کرواتا ہے لیکن تاریکیاں بڑھتی جاتی ہیں سائے پھیلتے جاتے ہیں۔ درد صلیبوں پر لٹکے اپنا لہجہ بے آب محسوس ہونے لگتا ہے۔ آئینے بدلنے سے چہرے تو نہیں بدل سکتے۔ اضطراب نارسا چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ کسی دیوار کا سایہ کوئی باران رحمت کی ردا سر پر نہیں اور تمام سائبان موم کے سائبان ہیں پناہ کہاں ملے اگر پناہ مل بھی جائے تو سپنوں کی وادی کا مسافر موم کے سائبان تلے اتنی دیر کیسے ٹھہرے۔

1994ء سے 1995ء تک ایک سال موم کے سائبان تلے گزار کر "ادھورے خواب" سمیٹ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اس سوچ کے ساتھ کہ غم ادراک اور کرب آگہی کے حصار میں ٹوٹنے والے خواب ادھورے ہی رہتے ہیں پورے نہیں ہوتے اسکی دوسری وجہ اپنا یہ احساس بھی ہو سکتا ہے۔

کیوں میں شانوں پہ کسی اور کا سر لے کے چلوں
اپنے لہجے میں کسی اور کی آواز سنوں

میرے پہلو میں دھڑکتا ہوا دل میرا ہے
بال و پر مانگ کے میں کس لیے پرواز کروں

اور پھر یقین و گمان، گیان و دھیان میں الجھ کر گزرنے والے لمحات سے کیفیات کا رنگ بدلتا جاتا ہے تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔

خود آگہی
اپنی نظر
اپنی تلاش
اب

خود آگہی کا مجھ کو نیا تجربہ ہوا
اپنی نظر سے آپ مرا سامنا ہوا
اپنی تلاش خود سے بہت دور لے گئی
اب سوچتی ہوں سامنے آنا برا ہوا

"ادھورے خواب لے کر اپنی تلاش کرنا بڑا معنی خیز اور دشوار عمل ہے۔
فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔
تلاش اور سفر ابھی باقی ہے۔

شہناز مزمل
یکم اکتوبر 1995ء
125 ایف ماڈل ٹاؤن لاہور

غزلیں

ہماری سوچ پر پہرے بٹھاؤ تم تو ہم جانیں
بندھے ہاتھوں سے زندہ لفظ ہم تحریر کرتے ہیں

نعت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

میں انتظار کروں یونہی عمر بھر آقاؐ
سیاہ شب کے مقدر میں لکھ سحر آقاؐ

مجھے زمین و زماں تک ہی کر دیا محدود
عطا ہوں مجھ کو مرے کھوئے بال و پر آقاؐ

ثنا ہو کیسے بیاں لفظ کھو گئے سارے
ہے اعتراف مجھے میں ہوں بے ہنر آقاؐ

تیرے حضور سے ملتا نہیں اشارا کوئی
سے فراق کا ہو جائے مختصر آقاؐ

جھلس گئی ہوں تمازت سے آگ موسم کی
سحاب بھیج دے رحمت کا میرے گھر آقاؐ

دراز کیسے کروں کاسۂ سوال حضور
جھکا ہوا ہے ندامت سے میرا سر آقاؐ

میں کیسے ہاتھ اٹھاؤں میں کیا سوال کروں
ہر اک دعا کو مری کر دے معتبر آقاؐ

○

دشمنوں سے دوستی کا تجربہ کیسا رہا
بدگمانی میں گماں کا ذائقہ کیسا رہا

زلزلے تو ذات کی دہلیز پر آتے رہے
ناقۂ خواہش ہوا سے رابطہ کیسا رہا

شدت غم کچھ ذرا کم ہو تو بتلانا مجھے
جبر موسم میں انا کا تجربہ کیسا رہا

فصلِ گل میں خوشبوؤں کی قید میں جکڑے رہے
پتھروں سے زخم تک کا فاصلہ کیسا رہا

وقت کے ساحل پہ طوفاں میں گھرے سوچا گئے
بادباں سے کشتیوں کا فاصلہ کیسا رہا

آرزوؤں کے تعاقب میں ہوئے اندھے مگر
ترکِ جاں ترک وفا کا حوصلہ کیسا رہا

آبلہ پا ہمسفر گرد سفر میں کھو گئے
کیا بتاؤں ہجرتوں کا سلسلہ کیسا رہا

یہ مری وحشت مری دیوانگی بتلائے گی
کاتب تقدیر تیرا فیصلہ کیسا رہا

○

میں چنار اور جنگل رات بھر اکیلے تھے
چاند کے سلگنے کا بھید پانے ٹھہرے تھے

جلتی بجھتی آنکھوں میں دیپ ٹمٹماتے تھے
بے خیال سوچیں تھیں واہموں کے گھیرے تھے

کرچیاں سی بکھری تھیں ہر طرف فضاؤں میں
پتھروں کے شہروں میں آئنوں کے میلے تھے

آبشار لفظوں کے سرکشی کے جذبوں سے
خواہشوں کے طوفاں میں کاغذوں سے کھیلے تھے

گہرے تیز پانی سے کشتیاں بچانے کو
ساحلوں پہ موجوں نے کیا عذاب جھیلے تھے

بستیوں میں رکنے کا خواب' خواب اس کا تھا
آسماں پہ اڑنے کے سارے خواب میرے تھے

وہ مکاں میں کیوں رہتا لامکان اسکا تھا
اور آگے جانے سے میرے پر بھی جلتے تھے

○

جو تھے منزلوں کے فراق میں سبھی راستے وہ مٹا دیئے
سرِ شام ہی جو بھڑک اٹھے وہ چراغ میں نے بجھا دیئے

ہیں فریب وقت میں قید تھی رُخ کارواں نہ بدل سکی
کڑی دھوپ میں جو ملے شجر تو وہیں پہ ڈیرے جما دیئے

کوئی نقش ملتا نہیں مجھے رُخِ فکر کیسے سنوار دوں
میرے ریزہ ریزہ سے خواب تھے شبِ نارسا میں جلا دیئے

مرا حوصلہ بھی عجیب تھا مرا ناخدا بھی عجیب تھا
مری جستجو جو بڑھی کبھی تہہ خاک رستے بنا دیئے

لئے ہاتھ میں وہ کٹے شجر رہے منتظر کہ ملے ثمر
نہ زمیں نے ان کو پناہ دی سبھی آسمان گنوا دیئے

کبھی سرد سرد سی دھوپ تھی کبھی تھی تپش جمی برف میں
نئے موسموں کے مزاج نے سبھی رخ فضا کے دکھا دیئے

کبھی واہموں نے ڈسا مجھے کبھی چیختی رہیں خواہشیں
میں جو مبتلائے فریب تھی سر دار سپنے سجا دیئے

نہ سمندروں سا مزاج تھا نہ فضاؤں جیسی تھیں وسعتیں
تو ہوا کے رخ پہ چراغ کیوں شب تار سارے جلا دیئے

○

خالی نظروں سے مجھے دیکھا کہا کچھ بھی نہیں
کیا ہوا ایسا کہ کہنے کو رہا کچھ بھی نہیں

عکس مجھ کو کیا دکھائے گا یہ ٹوٹا آئنہ
کرچیاں بکھری ہیں ہر سو اور بچا کچھ بھی نہیں

شبنمی آنکھیں مری تعبیر سے ڈرتی رہیں
جل بجھے تھے خواب سارے اور بچا کچھ بھی نہیں

آنسوؤں کا رتجگا ہے شام کی دہلیز پر
تلخ یادوں کے سوا اب تو رہا کچھ بھی نہیں

دائروں کے درمیاں گردش میں اک مدت سے ہوں
زندگی میری تلاطم کے سوا کچھ بھی نہیں

اپنی اپنی ذات کی دہلیز پہ سب رک گئے
مل کے لکھا فیصلہ لیکن ہوا کچھ بھی نہیں

سب غبار آلود چہرے اجنبی لوگوں کے تھے
منزلوں کی جستجو کی اور ملا کچھ بھی نہیں

جس نے جو کچھ بھی کہا چپ چاپ میں نے سن لیا
اک انا تھی درمیاں میں نے کہا کچھ بھی نہیں

زخم یہ شہؔناز کیسے مندمل ہو پائیں گے
ہیں مسیحا تو بہت لیکن دوا کچھ بھی نہیں

○

سائے پھیل جاتے ہیں درد رت کے ڈھلنے سے
چہرہ کس کا بدلا ہے آئینے بدلنے سے

جنگلوں کے سناٹے روح میں اترتے ہیں
خواہشوں کے موسم میں پافگار چلنے سے

خواب پھر سے جاگے ہیں نیم خواب آنکھوں میں
گھنٹیاں سی بجتی ہیں آرزو بدلنے سے

گرد گرد چہرہ ہے وحشتوں کے ڈیرے ہیں
تھک گئی ہوں کتنا میں دائروں میں چلنے سے

آؤ ایسا کرتے ہیں راہبر بدلتے ہیں
دیکھیں کون ملتا ہے منزلیں بدلنے سے

ظلمتوں کے چہرے سے آئینے ہٹا ڈالو
روشنی تو ہوگی کچھ جگنوؤں کے جلنے سے

رقص ہے شراروں کا آج رہگزاروں پر
بستیاں نہ جل جائیں راستوں کے جلنے سے

ذہن کے سلگنے سے جسم راکھ ہوتا ہے
زخم جلنے لگتے ہیں چاند کے نکلنے سے

○

چند آنسو مری پلکوں پہ سجے ہوں جیسے
سلسلے یاد کے بندھن سے بندھے ہوں جیسے

منتظر آنکھیں کھلے در پہ لگی ہیں ایسے
ٹمٹماتے ہوئے دو دیپ جلے ہوں جیسے

ایک مانوس سی خوشبو ہے فضا میں رقصاں
ہجر موسم میں کہیں پھول کھلے ہوں جیسے

ان کو دیکھا جو اچانک تو یہ احساس ہوا
اس سے پہلے بھی کبھی ان سے ملے ہوں جیسے

راکھ لے آئے ہیں کچھ اڑتی ہوا کے جھونکے
زخم احساس کے جنگل میں جلے ہوں جیسے

ہے سماعت پہ مری ہلکی سی آہٹ اب بھی
دو قدم ہم بھی کبھی مل کے چلے ہوں جیسے

خواب دیکھے نہیں شہناز بڑی مدت سے
آنکھ جھپکائے برس بیت گئے ہوں جیسے

○

دم رخصت اسے جینے کی دعا دی ہم نے
اور پھر آخری کشتی بھی جلا دی ہم نے

مل ہی جائے کسی تعبیر کو شاید کوئی خواب
عکس دیوار پہ تصویر بنا دی ہم نے

روح کو جسم کے زندان میں رکھنے کے لیے
بزمِ امید ستاروں سے سجا دی ہم نے

ہم اسیران انا تشنہ لبِ بام گئے
بازئِ زیست بھی داؤ پہ لگا دی ہم نے

تیرگی حد سے بڑھی دل کے نہاں خانوں میں
بھولنے والے تری یاد جلا دی ہم نے

ڈوبتی شام میں کرنوں کو بچانے کے لیے
ریت کے گھر پہ بھی دیوار اٹھا دی ہم نے

کون آئے گا پلٹ کر ہمیں لے جانے کو
لو چراغوں کی سرِ شام بڑھا دی ہم نے

راکھ ہو جاتے تری آگ سے سندر سپنے
آرزو شمع تری خود ہی بجھا دی ہم نے

بدگمانی سے نکل آئے گماں کی حد پر
بے یقینی کی فضا آج مٹا دی ہم نے

اپنی ہی سانسوں سے دم گھٹنے لگا جب شہناز
قرضِ جاں دے کے سزا اپنی گھٹا دی ہم نے

○

نظر میں غیر کی وہ معتبر ہونے نہیں دیتا
صدف کو توڑ کر مجھ کو گہر ہونے نہیں دیتا

وہ اپنی اور میری زندگی کے درمیاں اکثر
اٹھا رکھتا ہے اک دیوار در ہونے نہیں دیتا

وہ خود سر ہے مگر اک ڈھال بن کر ساتھ رہتا ہے
حوادث کا کبھی مجھ پر اثر ہونے نہیں دیتا

میں چھاؤں اپنی ممتا کی یہاں پر بانٹنا چاہوں
مجھے وہ اپنے سائے میں شجر ہونے نہیں دیتا

زمانہ ساز نظروں سے وہ سب کچھ بھانپ لیتا ہے
مگر اپنے ارادوں کی خبر ہونے نہیں دیتا

بدلتی رت کی خوشبو اس کو دیوانہ بناتی ہے
بدلتے موسموں کو ہمسفر ہونے نہیں دیتا

وہ میری سوچ کا تانا سدا الجھائے رکھتا ہے
ہجومِ فکر میں بھی بے ہنر ہونے نہیں دیتا

مرے رنگین سپنے آ کے اکثر توڑ جاتا ہے
ہے اسکا مجھ پہ احساں بے بصر ہونے نہیں دیتا

در آتا ہے مرے احساس میں خوشبو کی صورت وہ
تصور میں بھی خود سے بے خبر ہونے نہیں دیتا

وہ سارے تیر ترکش کے مجھی پر آزماتا ہے
کبھی شہنازؔ مجھ کو بے سپر ہونے نہیں دیتا

○

خطا اپنی چھپانے کو نئی تدبیر کرتے ہیں
وہ مجرم ہو کے یوں بھی جرم کی تشہیر کرتے ہیں

یہاں پر غاصبوں اور خود پرستوں نے کیا قبضہ
مٹا کر یہ جہاں دنیا نئی تعمیر کرتے ہیں

عجب انداز سے اپنا تخیل کُنجِ زنداں میں
کبھی تجسیم کرتے ہیں کبھی تصوِیر کرتے ہیں

ہماری سوچ پر پہرے بٹھاؤ تم تو ہم جانیں
بندھے ہاتھوں سے زندہ لفظ ہم تحریر کرتے ہیں

خود اپنا سر ہتھیلی پر سجا کر کوئے قاتل میں
کسی صورت ہم اپنی فکر کو زنجیر کرتے ہیں

○

دھوپ کی چادر اوڑھ کے سر پر چلتی ہوں
اپنی آگ میں تنہا خود ہی جلتی ہوں

آوازوں کے بوجھ کی گٹھڑی لاد کے میں
چپ کے زینے خاموشی سے چڑھتی ہوں

خود کو یکجا کر لینے کی کاوش میں
ریزہ ریزہ ہو کر روز بکھرتی ہوں

○

اونچی پروازوں کا حق مجھ کو ادا کرنا پڑا
بال و پر کٹوانے کا خود فیصلہ کرنا پڑا

ریت کی مانند بکھرا تھا فضاؤں میں وجود
وسعتوں میں وحشتوں کا سامنا کرنا پڑا

حضرتِ انسان جب انسانیت سے گر گئے
فرضِ انساں بھی فرشتوں کو ادا کرنا پڑا

روشنی پھیلی ہے ہر سو میرے دل کی آگ سے
ظُلمتِ شب کو بھی مجھ سے رابطہ کرنا پڑا

روگ دل کا بن گیا جب روگ میری جان کا
دشتِ وحشت سے سفر کا فیصلہ کرنا پڑا

یاد اسکی بوجھ جب بننے لگی شہنازؔ پر
بھول جانے کا اسے پھر حوصلہ کرنا پڑا

○

ہم خاک بسر ریت کے صحرا میں کھڑے ہیں
پیاسے ہیں مگر اپنے اصولوں پہ اڑے ہیں

لے جائے کہیں بھی ہمیں سیلاب محبت
ہم کب کسی طوفان کے ریلوں سے ڈرے ہیں

ہم نے بھی کفن باندھ لیے اپنے سروں سے
سب تیر ابھی اپنی کمانوں میں پڑے ہیں

ڈٹ جائیں تو فولاد کی دیوار ہیں ہم بھی
ہم ٹوٹ نہ پائیں گے کوئی کچے گھڑے ہیں

پھر آلِ علیؑ آج ہے شمشیر کی زد میں
پھر ہاتھ میں نیزے لیے جلاد کھڑے ہیں

دریا بھی اگر چاہے تو رخ اپنا بدل لے
ہم کب یہاں موجوں کے سہارے پر پڑے ہیں

اس شامِ غریباں میں نہیں ساتھ کوئی بھی
بکھرے ہوئے لاشے تو بہر سمت پڑے ہیں

سودا نہیں کرتے جو کبھی اپنی انا کا
ہے سچ کہ زمانے میں وہی لوگ بڑے ہیں

○

جنوں کے دور میں خود سے بھی رابطہ کب تھا
کبھی زمانے سے کچھ بھی کہا سنا کب تھا

میں گرد راہ کو منزل کا راستہ سمجھی
مری نگاہ کا دھوکا تھا قافلہ کب تھا

مزاج زیست نہ بدلا کسی بھی موسم نے
نئی فضا میں نئی رت کا ذائقہ کب تھا

ہجوم فکر کی تجسیم کس طرح ہوتی
نظر کے سامنے منظر کوئی بنا کب تھا

میں کس سے آبلہ پائی کی داستاں کہتی
سفر کے بعد ہوا تم سے رابطہ کب تھا

ہوا کو سونپ دیا ریزہ ریزہ ہوتا وجود
بکھر کے جینے کا شہناز حوصلہ کب تھا

○

کوئی بھی حرف دعا اب اثر نہیں رکھتا
مرا خدا بھی تو مجھ پر نظر نہیں رکھتا

ہوا کو کس لیے بے چہرگی کا صدمہ ہے
یہاں تو کوئی بھی شانوں پہ سر نہیں رکھتا

وہ دشت خواب ہو ویرانہ ہو کہ صحرا ہو
جنوں کی راہ میں حد سفر نہیں رکھتا

انا ہو کس طرح آزاد جاں کے محبس سے
مرا وجود ہے دیوار در نہیں رکھتا

بتاؤں کیسے جو میرے گماں کا ممکن ہے
ہوا کے دوش پہ رہتا ہے گھر نہیں رکھتا

نہ جانے کیا ہوا اس کو کہ ایک مدت سے
دیا جلا کے سرِ رہ گذر نہیں رکھتا

بھنور کا اور بگولوں کا رقص جاری ہے
وہ دائروں کے مقدر میں ڈر نہیں رکھتا

○

زندگی سے کیا ڈرنا آگہی سے ڈرتی ہوں
تیرگی کے موسم میں روشنی سے ڈرتی ہوں

ان سے اک تعلق ہے حرفِ غم گساری تک
کب یہ ٹوٹ جائے گا اس گھڑی سے ڈرتی ہوں

میں سمیٹ سکتی ہوں فاصلے سرابوں کے
تند خُو سمندر کی برہمی سے ڈرتی ہوں

جبر کی مشقت تو سہہ رہی ہوں صدیوں سے
درد ہو نہاں جس میں اس خوشی سے ڈرتی ہوں

پتھروں کی بستی میں آئینے اٹھا لائی
کانچ کانچ جذبوں کی نازکی سے ڈرتی ہوں

زرد رُت کے سناٹے میری جاں کے دشمن ہیں
سردیوں کے موسم میں چاندنی سے ڈرتی ہوں

○

کانچ کا شہر ہے اور لوگ ہیں پتھر سارے
ہاتھ میں تیشہ لیے پھرتے ہیں رہبر سارے

چشم پوشی کا سلیقہ ہی سکھا دے مجھ کو
زخمی کر دیتے ہیں احساس کے نشتر سارے

عہدِ رفتہ کی اسیری سے رہائی دے مجھے
یا بدل ڈال مری سوچ کے محور سارے

ہے تمنا تجھے دنیا کی تو بیچ اپنا ضمیر
اہلِ دل اہلِ نظر رہتے ہیں بے گھر سارے

کعبۂ دل رہے آباد دعا کر شہناز
اور اب توڑ دے اغیار کے مندر سارے

○

میں تو ہوں اک سیپ کا موتی بیچ سمندر رہنا تھا
آبِ رواں سے تاب بڑھی تھی طوفانوں کو سہنا تھا

دیکھ رہی ہوں خون کا دریا ڈھونڈ رہی ہوں قاتل کو
میں نے خود کو قتل کیا ہے یہ مقتول کا کہنا تھا

آنکھوں میں چبھتی رہتی ہیں کرچیں ٹوٹے خوابوں کی
کرب نہ سہہ پائیں جب آنکھیں اشکوں کو تو بہنا تھا

میری فصیل جاں تو کب سے زخموں سے مسمار ہوئی
ڈھلتی عمر کا ڈھلتا سورج ڈھلتی عمر کا گہنا تھا

آؤ میرے پاس بھی بیٹھو دکھ سکھ اپنا بانٹیں ہم
کچھ باتیں مجھ کو کرنی ہیں کچھ تم کو بھی کہنا تھا

○

روز و شب کے سلسلے یوں جوڑتے رہتے ہیں ہم
قریۂ صد آرزو میں گھومتے رہتے ہیں ہم

دوست سارے دشمنوں کی صف میں شامل ہوگئے
آج بھی ان کا پتا کیوں پوچھتے رہتے ہیں ہم

جنبشِ لب کام ان کی کر گئی، اچھا ہوا
اَن کہی کچھ داستانیں ڈھونڈتے رہتے ہیں ہم

اوڑھ لی جب اپنے اوپر خود ہی چادر دھوپ کی
سایۂ دیوار پھر کیوں ڈھونڈتے رہتے ہیں ہم

خود ہی دانستہ نہیں رکھتے کسی سے رابطہ
پھر بھی کیوں اندر ہی اندر ٹوٹتے رہتے ہیں ہم

○

ہم تند ہواؤں کے ارادے نہیں سمجھے
بدلے ہوئے موسم کے تقاضے نہیں سمجھے

کیوں سر کو پٹختی رہیں موجیں لبِ دریا
سلگے ہوئے ساحل کے کنارے نہیں سمجھے

خیرہ نہیں کرتے یہ جلاتے ہیں نشیمن
بدلی میں چھپے شوخ شرارے نہیں سمجھے

ہے کتنا کٹھن درد کے صحرا سے گزرنا
یہ بات مقدر کے ستارے نہیں سمجھتے

اے خاکِ بدن شعلۂ جاں بجھنے لگا ہے
کیوں دیدۂ حیراں کے اشارے نہیں سمجھے

○

ادھ کھلی آنکھوں میں ٹھہری منظروں کی آرزو
اندھے رستے کر رہے ہیں منزلوں کی آرزو

توڑ کر مٹی مری دوبارہ کیوں گوندھی گئی
کر رہا ہے یہ جہاں کن صورتوں کی آرزو

آسماں پر ابر کا ہلکا سا بھی ٹکڑا نہیں
خشک مٹی کر رہی ہے بارشوں کی آرزو

پھر مرا ذوق تخیل بھی مجسم ہو گیا
پھر ہوئی ذوق سفر کو قافلوں کی آرزو

اک عجب منظر میرے پیش نظر ہے آج کل
پیار کی دہلیز پر ہے نفرتوں کی آرزو

جب زمین و آسمان آپس میں مل سکتے نہیں
کر رہی ہے خاک پا کیوں رفعتوں کی آرزو

حلقۂ گرداب میں شہناز اک مدت سے ہے
دائروں کے باسیوں کو ساحلوں کی آرزو

○

اب شہر آرزو کے منظر بدل گئے ہیں
رستے بدل گئے ہیں رہبر بدل گئے ہیں

یاس و ہراس کیسا ہر شے پہ چھا گیا ہے
دیرینہ چاہتوں کے محور بدل گئے ہیں

باطل کی گہری چادر صدق و صفا پہ چھائی
بیتی روایتوں کے پیکر بدل گئے ہیں

یہ شہر تو ہے میرا آنکھیں ہیں اجنبی سی
چہرے بدل گئے ہیں یا گھر بدل گئے ہیں

مسموم ہیں فضائیں معصومیت کہاں ہے
کھلتے گلاب چہرے یکسر بدل گئے ہیں

مظلوم تو وہی ہیں فرق اسقدر پڑا ہے
قاتل بدل گئے ہیں خنجر بدل گئے ہیں

ہم لا الہ کی خاطر اک سائباں تلے ہیں
دستار تو وہی ہے کچھ سر بدل گئے ہیں

اس بار فصل گل بھی شہناز یونہی گزری
ان موسموں کے کیسے تیور بدل گئے ہیں

○

ٹوٹی دہلیز پہ اک چاند سجا لوں تو چلوں
پتھروں میں بھی کوئی جوت جگا لوں تو چلوں

بولتے تم نے سنا ہے کبھی سناٹے کو
دے کے آواز تمہیں دل کی سنا لوں تو چلوں

کیسی بیگانگی ہے خود کو نہ پہچان سکوں
اپنے ہمراز سے یہ راز چھپا لوں تو چلوں

آس کی ڈور جو الجھی تو میں سلجھا نہ سکی
زخم امید کے سارے ہی جلا لوں تو چلوں

شورش دل کوئی ہنگامہ نہ برپا کر دے
ایک محشر ہے بپا اس کو چھپا لوں تو چلوں

دشتِ وحشت میں بھٹکنا ہی مقدر ٹھہرا
تیشۂ کرب سے جاں اپنی بچا لوں تو چلوں

ہے مرا خواب ادھورا اسے پورا کر لوں
نئی تعبیر کا عنوان بنا لوں تو چلوں

مژدۂ صبحِ بہاراں تو سنا ہے شہنازؔ
شب کے چہرے سے گرا پردہ اٹھا لوں تو چلوں

○

کسی پہ اتنا بھی تقدیر کا حصار نہ ہو
خود اپنے آپ پہ اپنا ہی اختیار نہ ہو

مری تلاش یونہی رائیگاں نہ ہو جائے
ملے مراد تو پھر وقتِ انتظار نہ ہو

سمیٹ لینا فضاؤں سے ساری رنگینی
کسے خبر کہ مقدر میں پھر بہار نہ ہو

میں اعترافِ ہنر جب کروں گی شیشہ گرو
بناؤ آئینہ ایسا کہ عکس یار نہ ہو

سفینے چھوڑ دیئے ہیں ہوا کے رُخ پہ اگر
دعا کے بادباں پھیلاؤ دل فگار نہ ہو

نکل کے دیکھوں بگولوں کے ساتھ صحرا میں
مجھے تلاش ہے جس کی پسِ غبار نہ ہو

○

بکھر کے ٹوٹنے والے صدا نہیں کرتے
کوئی بھی کام خلافِ انا نہیں کرتے

شجر پہ بیٹھے ہوئے پنچھیوں سے بات کرو
فضا میں اڑتے پرندے سنا نہیں کرتے

گہر شناس ہیں طوفاں کے ساتھ رہتے ہیں
سمندروں سے عداوت کیا نہیں کرتے

بڑی خموشی سے آکر زمیں پر گرتے ہیں
فلک سے ٹوٹتے تارے صدا نہیں کرتے

بس ایک بار ہی قسمت ہم آزماتے ہیں
پھر اس کے بعد کسی سے گلہ نہیں کرتے

بجھا دیئے ہیں سرِ شام آرزو کے چراغ
ہوا کے رُخ پہ دیئے تو جلا نہیں کرتے

○

کیا ہے چاک جگر اپنی داستاں کے لیے
میں تیرے سامنے ہوں اگلے امتحاں کے لیے

خراج بانٹتے پھرتے نہیں زمیں والے
خراج کیسے ملے مجھ کو میری جاں کے لیے

لہو میں میرے تڑپتی ہیں بجلیاں اب بھی
الاؤ سرد نہیں شعلۂ نہاں کے لیے

شکستِ دل کا فسانہ کہوں تو کیسے کہوں
بچا تو کچھ بھی نہیں زیبِ داستاں کے لیے

بساط اپنی سمیٹو کہ وقت رخصت ہے
ہیں چند لمحے فقط یادِ رفتگاں کے لیے

خود اپنے آپ سے بوجھل ہے زندگی شہنازؔ
کیا ہی کیا ہے ابھی عمرِ رائیگاں کے لیے

○

اک بحرِ بے کنار کی گہرائیوں میں ہوں
گھری بہت ہے سوچ ابھی فیصلوں میں ہوں

رستہ تلاش کرنے کی فرصت کہاں مجھے
میں ذوقِ آگہی کی حسیں سرحدوں میں ہوں

منظر مری نگاہ میں مت ڈھونڈنا ابھی
کھوئی ہوئی خیال کی رعنائیوں میں ہوں

دشتِ جنوں سے سب ہی پلٹ آئے اور میں
طشتِ طلب اٹھائے گھری خواہشوں میں ہوں

○

مات سے پہلے بات بنائی جاسکتی تھی
نفرت کی دیوار گرائی جاسکتی تھی

چندا کی تنویر چرائی جاسکتی تھی
مٹی کی تقدیر جگائی جاسکتی تھی

ناحق ہم تم کھیلے جلتے شعلوں سے
جذبوں کی یہ آگ بجھائی جاسکتی تھی

موجوں کا پیغام نہ سمجھا ساحل نے
ورنہ ڈوبتی ناؤ بچائی جاسکتی تھی

سناٹوں میں ہاتھ کٹا کر بیٹھ گئے
خاموشی مصرف میں لائی جاسکتی تھی

شاعرِ بے باک کو بیڑی پہنا کر
زنداں کی توقیر بڑھائی جاسکتی تھی

ظالم بن کر ظلم مٹایا جیت گئے
حق کی خاطر مات بھی کھائی جاسکتی تھی

○

وہ دن بھی کیا تھے غم سے کوئی واسطہ نہ تھا
در پیش اپنے کوئی کٹھن مرحلہ نہ تھا

دہلیز اپنی ذات کی کب ہم نے پار کی
در کونسا تھا ایسا جو ہم پر کھلا نہ تھا

وہ ملتفت ہماری طرف انجمن میں تھے
عرضِ طلب کا ہم کو مگر حوصلہ نہ تھا

ہر نقش پا پہ ہو نہ سکی خم جبینِ شوق
جو نقش بھی ملا وہ ترا نقشِ پا نہ تھا

ہم داستانِ درد سناتے تو کس طرح
محفل میں تیری کوئی بھی درد آشنا نہ تھا

محسوس اس کو میں نے کیا ہے قریبِ جاں
میرے تخیلات سے وہ ماورا نہ تھا

یوں تو جہانِ رنگ میں سب کچھ تھا اس کے پاس
شہنازؔ کی وفاؤں کا لیکن صلہ نہ تھا

○

ساتھ چلنے کے لیے وہ ذرا تیار تو ہو
محرمِ غم نہ سہی محرمِ اسرار تو ہو

میں ہوں بے تاب سنے کوئی تو رودادِ ستم
بڑھ کے پوچھے تو ذرا وہ مرا غمخوار تو ہو

ڈھونڈ لائے گا مرا دیدۂ حیراں تجھ کو
قافلہ آئے یہاں مصر کا بازار تو ہو

بے زبانی کی زباں سے بھی بہت کچھ کہہ دوں
پردہ ہٹ جائے ذرا آپ کا دیدار تو ہو

شہرِ دل آج بھی ویران نظر آتا ہے
سامنا ربِ بہاراں ذرا اک بار تو ہو

اس کڑی دھوپ میں جلتا ہے سراپا شہناز
ابرِ باراں نہ سہی سایۂ دیوار تو ہو

○

جو ساتھ اپنے سفر پہ نکلے نہ جانے سب وہ کدھر گئے ہیں
گئی رتوں کے بدلتے تیور ہمیں تو برباد کر گئے ہیں

فضائیں مسموم ہو چکی ہیں زمینِ دل سخت ہوگئی ہے
حسین جذبوں کا نرم ریشم بچھانے والے گزر گئے ہیں

رفاقتوں کا مسافتوں کا حساب دینا ہوا ہے مشکل
جو ساتھ اپنے سفر پہ نکلے نہ جانے سب وہ کدھر گئے

سراغِ دنیا بہت ہے مشکل سراغ اپنا ہی کب ملا ہے
ابھی تو رستہ بہت ہے باقی تھکن سے چہرے اتر گئے ہیں

نہ دوستی گر نبھا سکے وہ تو دشمنی بھی روا نہیں تھی
بجھا کے سارے چراغ وہ خود ہوا پہ الزام دھر گئے ہیں

○

بدلتے موسموں میں جانے کیا مجھ کو نظر آیا
کہ ان کا کرب سارا میرے اندر ہی اتر آیا

عجب سی بے کلی محسوس ہوتی تھی تمہیں گھر میں
نکل کے گھر سے باہر یاد کیسے اپنا گھر آیا

دریچے بند تھے دل کے کوئی بھی در کھلا کب تھا
کسی کی یاد کا جھونکا نہ جانے کیسے در آیا

زمانے بھر کو بھی اس سے عقیدت ہوگئی شاید
کہ جب بھی بام پر آیا وہی بیداد گر آیا

میری جلتی ہوئی شامیں دھنک رنگوں سے بھر ڈالیں
نظر قوسِ قزح سی لے کے میرا ہم سفر آیا

اُجالوں کی مسافت بھی مقدر میں تو لکھ دیتا
کہ میری خاک کے حصے میں یہ اندھا سفر آیا

سزا تو دشتِ وحشت میں بھی ہم نے کاٹ لی لیکن
ہوا کی سسکیوں سے آنکھ کا پیمانہ بھر آیا

○

جاگتی آنکھوں میں نے جو کچھ دیکھا تھا
خواب تھا وہ اور خواب سراسر جھوٹا تھا

وقت کے ظالم ہاتھوں نے سنگسار کیا
کانچ کا وہ گھر جس میں کوئی رہتا تھا

بکھر چکے تھے سب کھلیان امیدوں کے
بھیگی رت تھی بھیگا بھیگا چہرا تھا

برسوں ساتھ چلے تھے ملکر ہم دونوں
منزل ایک تھی اپنا ایک ہی رستہ تھا

ایک بدلتی رت نے پھیکا کر ڈالا
تیری چاہت کا رنگ اتنا کچا تھا

میں نے ہی کچھ دیر پلٹنے میں کی تھی
اس نے تو ہر گام پہ مجھ کو ڈھونڈا تھا

بکھر گئے تھے ریزہ ریزہ ہو کر خواب
ٹوٹ گیا جو میں نے سپنا دیکھا تھا

آنے والے کل کی خاطر زندہ ہوں
کل جو گزرا وہ کب میرا اپنا تھا

چلتے چلتے کتنی صدیاں بیت گئیں
منزل بالکل پاس تھی رستہ ٹیڑھا تھا

○

تھک کر مسافتوں سے بکھرنے لگی ہوں میں
چپ چاپ اپنی آگ میں جلنے لگی ہوں میں

مدت سے ایک گنبدِ بے در میں قید ہوں
اُمید کی کرن سے بھی ڈرنے لگی ہوں میں

پھر مجھ کو جستجو کہ ملے تیرا نقشِ پا
پھر ایک امتحاں سے گزرنے لگی ہوں میں

آزردہ کر دیا ہے مجھے میرے شوق نے
اپنا رُخِ خیال بدلنے لگی ہوں میں

شمعِ حیات پھر سے ہے روشن نہ جانے کیوں
کیا آرزو حیات کی کرنے لگی ہوں میں

○

سلگتی ذات کا منظر تمہیں دکھلا نہیں سکتی
ہوں مجرم آگہی کی کرب یہ سمجھا نہیں سکتی

چھپے ہیں میری مشت خاک میں کچھ آہنی جذبے
میں ان کو وقت کی بھٹی میں یوں پگھلا نہیں سکتی

میں چن کر لفظ اپنے جذب کو تصویر کرتی ہوں
جنوں کا سربریدہ جسم میں سلوا نہیں سکتی

ہجوم شہر میں بھی کس قدر تنہا ہوں مت پوچھو
جسے اپنا سمجھتی ہوں اسے اپنا نہیں سکتی

قلم ہے ہاتھ میں میرے زباں خاموش ہے تو کیا
میں سچ لکھوں گی اپنے ہاتھ میں کٹوا نہیں سکتی

اضطرابِ نارسا

یہ سربریدہ خواہشیں نگل رہی ہیں کیوں مجھے
یہ سرکشیدہ حسرتیں ہیں میرے ساتھ ساتھ کیوں
اے اضطرابِ نارسا عذابِ دید یاد رکھ
ہوائیں دربدر سی ہیں یہ شہرِدل بھی خاک ہے
میں حرف حرف پیاس ہوں نظر نظر سراب ہے
ذرا سا عکسِ آب جو بہت بڑا عذاب ہے
میں سن رہی ہوں بازگشت پھر سے لحنِ وقت کی
نجوم شب بکھر گئے ہیں پھر کسی فراق میں
بلا رہے ہیں کیوں مجھے یہ چاہتوں کے آبشار
محبتوں کے سلسلوں سے اٹھ گیا ہے اعتبار
تری صدا سے اک ذرا جو ابرِ خوف چھٹ گیا
تو اضطرابِ نارسا کا کرب اور بڑھ گیا
اے اضطرابِ نارسا عذابِ دید یاد رکھ
ہیں سربریدہ خواہش عذابِ دید یاد رکھ
سراپا اپنی کھو چکے ہیں وقت کے غبار میں
بدن دریدہ پھر رہے ہیں ہر نئے مدار میں
سماعتوں پہ اپنی تو کبھی نہ اعتبار کر

اے شب گزیدہ ہمسفر، سفر نہ اختیار کر
محبتوں کے سلسلے نہ اور استوار کر
اے اضطرابِ نارسا عذابِ دید یاد رکھ
ہیں سربریدہ خواہشیں عذابِ دید یاد رکھ
اے اضطرابِ نارسا عذابِ دید یاد رکھ

چھاؤں جلتی رہی

میری شہہ رگ میں بہتا لہو جم گیا
میرا دل تھم گیا
سایہ کب مل سکا
چھاؤں جلتی رہی
دل جلاتی خراشیں مرے ساتھ تھیں
میں بھی بجھتی ہوئی راکھ کے ڈھیر میں
سانس لیتی رہی
کتنے موسم یونہی بے ثمر سے گئے
پتے جھڑتے رہے نخلِ امید کے
چھاؤں جلتی رہی
زخم تپتے رہے
موسموں کے حسیں رنگ ڈھلتے گئے
وہم کے ناگ بڑھ بڑھ کے ڈستے رہے
جال بنتے گئے
اور شکاری مچانوں کو تکتے رہے
راستے ہم سے ملکر بچھڑتے رہے
ہمسفر کچھ ملے ساتھ چلتے رہے
شہر سا بن گیا میرے اطراف میں
اور دیوانہ پن میرا بڑھتا گیا
میرے اندر جو لاوا تھا افکار کا
وہ پگھلتا رہا

اک تلاطم سا سینے میں برپا رہا
خود بخود لفظ مجھ پر اترتے رہے
شعر ہوتے رہے
فکر کی بھیڑ میں میں بھی کھو سی گئی
کیسے پہچان سکتی کہاں پر ہوں میں
فکر کا شہر تھا ایک جادو نگر
خوف تھا مجھ کو پتھر نہ بن جاؤں میں
مڑ کے دیکھا نہیں
دل کی دہلیز سے دور ہوتی گئی
کون ہوں میں کہاں ہوں
پتا کچھ نہیں
خود کو پہچاننا اب تو دشوار ہے
سانس چلتی رہی میں بھی بڑھتی رہی
گھاؤ جب بھی ملے مجھ کو ایسا لگا
میری شہہ رگ میں بہتا لہو جم گیا
میرا دل تھم گیا
سایہ کب مل سکا
چھاؤں جلتی رہی

درد صلیبیں

کبھی تند ہوا کے جھونکوں سے
مجبور پرندے ٹکراتے
کبھی عشق کے اندھے موسم میں
عفریت خزاں کے در آتے
کبھی درد صلیبوں پر جاناں
قزاق فضا کے کھنچواتے
ماحول کی ڈوبتی نبضوں میں
دم سادھے بیٹھے سوچتے تھے
کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے
ایک انساں ہو جلاد نما
جو درد صلیبوں پر لٹکے
مصلوب پرندوں پر آکر
تیشے سے ضرب لگاتا ہو
اور کیلیں ٹھونکتا جاتا ہو
یہاں اکثر ایسا ہوتا ہے
یہ منظر میں نے دیکھا ہے
پھر دیکھ رہی ہوں میں جاناں
ہر شخص ہراساں پھرتا ہے
اک مردہ پھیکی حیرت وہ
چہرے پہ سجائے رکھتا ہے
زندہ سا نظر آنے والا

اک ساکت ذہن و جسم لیے
بس چلتا پھرتا رہتا ہے
دم اسکا گھٹتا رہتا ہے
منظر تو آخر منظر ہے
ہر وقت بدلتا رہتا ہے
پھر گرتا پردہ اٹھتا ہے
پھر میری آنکھیں دیکھتی ہیں
پھر تیز ہوا کے جھونکوں سے
مجبور پرندے ٹکراتے
پھر عشق کے اندھے موسم میں
عفریت خزاں کے در آئے

بپتا ایک عورت کی

کیا تجھے یاد ہے اک بار کہا تھا تو نے
دھند ہی دھند ہے دم گھٹنے لگا ہے میرا
راہبر کوئی نہیں ہے جو دکھائے منزل
کیا مرے ساتھ سفر تجھ کو گوارا ہو گا
سایہ بن کے تو سدا ساتھ رہے گی میرے
غم و آلام بھی تو ساتھ سہے گی میرے
مانگ تیری میں ستاروں سے سجا رکھوں گا
دل سنگھاسن کی تجھے رانی بنا رکھوں گا
میں دھنک رنگوں سے چنری کو تری بھر دونگا
میرا جو کچھ بھی ہے وہ نام ترے کر دونگا
کتنی نادان تھی قیدی میں ہوئی لفظوں کی
ہمسفر بن کے ترے ساتھ میں چلتی ہی رہی
وقت تو ٹھہرا نہیں عمر مری ڈھلتی رہی
آگ جو تیری محبت نے لگائی جاناں
بن کے ایندھن میں اسی آگ میں جلتی ہی رہی
اوڑھ لی میں نے مسافت تو تھکن بڑھتی رہی
روز گرتی رہی گر گر کے سنبھلتی بھی رہی
کیا تجھے یاد ہے کچھ وقت گزر جانے پر
مجھ سے اک بار میری جان کہا تھا تو نے
ساتھ رہنے کے لیے خوشیاں ضروری تو نہیں
ساتھ چلنا ہے تو گرداب میں جینا ہو گا

ضبط گریہ سے تجھے ہونٹوں کو سینا ہوگا
کاٹ کر کشت لبوں پر نہ شکایت ہوگی
بن کے سقراط تجھے زہر بھی پینا ہوگا
تو جو عورت ہے ترے ذمے ہے دکھ ہی سہنا
بے زبان رہنا زباں سے نہ کبھی کچھ کہنا
پا بریدہ تجھے گر گر کے سنبھلنا ہوگا
اپنے ہر خواب کو آنکھوں میں کچلنا ہوگا
تو کسی بات پہ اصرار نہ کرپائے گی
تو کسی بات سے انکار نہ کرپائے گی
مجھ سے مجرم کو سزاوار بھی سمجھے لیکن
تو کسی طور نگوں سار نہ کرپائے گی
اپنا ہر راستہ خود تجھ کو بنانا ہوگا
اپنا ہر بوجھ تجھے خود ہی اٹھانا ہوگا
تلخ احساس سے دم تیرا اگر گھٹنے لگے
اپنی دنیا کے خدا سے بھی چھپانا ہوگا
دکھ کسی طور کسی کو نہ سنانا ہوگا
چشم گریہ کبھی کھل کر نہ برس پائے گی
اور ہر تیر ستم سینے پہ کھانا ہوگا
واسطہ تیرا رہے گا سدا حیوانوں سے
بھیڑیئے کتنے ہی غراتے ہوئے آئیں گے
یہ ہے دنیا یہاں ابلیس رہا کرتے ہیں
اپنے دامن کو سدا ان سے بچانا ہوگا

کئی شیطانوں کو انسان بنانا ہوگا

تیری ہر بات پہ خم میں نے کیا اپنا سر
اپنے ہی ہاتھوں پہ روکے کئی چلتے خنجر
شعلوں سے تجھ کو بچانے کے لیے جان عزیز
چشم پرنم میں ڈبو لی تھیں ردائیں اپنی
جو دھنک رنگ مری چنری میں باندھے تو نے
ان کو نمناک کیئے رکھا ہمیشہ میں نے
آگ جو بھڑکی کبھی ان سے بجھائی میں نے
میں دھنک رنگ بنی ساتھ تیرے چلتی رہی
روح کے قریہ ویراں کو چھپائے رکھا
بڑھتے طوفان میں اک لو کو جلائے رکھا
آخرش ایسا بھی اک بار ہوا تھا جاناں
سانس رکنے لگی اور حوصلہ نہ مجھ میں رہا
گھٹ گئی سانس تو بے ساختہ نکلی تھی کراہ
اور چکرا کے توازن نہ رہا تھا قائم
تو نے اسدن جو کہا تھا وہ تجھے یاد ہے کیا
مکر کیوں کرتی ہے !اے عورت بدذات بتا
سب ہیں چالاکیاں کچھ بھی تو نہیں تجھ کو ہوا
تو سمجھتی ہے پسند آئے گی تیری یہ ادا
تیری اس چال پہ ملتی ہے ابھی تجھ کو سزا
ہے مرے پاس یہ حق آج ہی دے دوں گا طلاق
تو تو عورت ہے تجھے اور بھگتنا ہے عذاب

حسن باقی نہ ترا ہے نہ جوانی تجھ میں
مجھ میں دم خم ہے ابھی اور جوانی مجھ میں
لڑکھڑاتی ہوئی چپ سادھ کے کیسے چلدی
کیا رہا باقی تھا جو بات میں تجھ سے کرتی
کاش پڑھ سکتا کبھی تو بھی مرے چہرے کو
کاش آکر شبِ ہجراں میں خبر بھی لیتا
کاش وہ شامِ غریباں جو مجھے ڈستی تھی
تیرا سویا ہوا احساس جگا بھی سکتی
خوب ہے یاد مجھے جو بھی کہا تھا تو نے
خوب ہے یاد مجھے جو بھی سہا تھا میں نے
کیا کبھی تجھ سے بھی اظہار کیا تھا میں نے
جانثاری کا ہی کردار کیا تھا میں نے
کیا تجھے یاد ہے کیا تجھ سے کہا تھا میں نے

بکھری سوچیں

تنکا تنکا بکھری سوچیں
کچی پکی ادھڑی سوچیں
دیمک بن کر چاٹ رہی ہیں
ٹکڑے ٹکڑے کر کے مجھ کو
کیوں حصوں میں بانٹ رہی ہیں

بندھے ہاتھوں کے زندہ لفظ

مرے احساس کو مغلوب کر دینے کی سازش میں
مرے رستے کی ساری روشنی کس نے بجھا دی ہے
مرے ہاتھوں کو کس نے جبر کی ڈوری سے باندھا ہے
اے مرے مہرباں
مجھ کو نہ یوں مفلوج کرنے کی تو کوشش کر
یہ رستے میرے رستے ہیں
اگر ان راہ گزاروں پر کبھی سورج نہ چمکے
یہ تاریکی میں چھپ جائیں
مرے اندر اجالا ہے
میں اسکی روشنی میں
رات کو بھی دن بنا لوں گی!
مرے ہاتھوں کو بے شک جبر کی زنجیر پہنا دو
میں اپنے ان بندھے ہاتھوں سے زندہ لفظ لکھوں گی

رزقِ ہوا

ہم خزاں سوختہ
تیری گل پوش وادی میں آ بھی گئے
اس سے کیا فائدہ
ہم ہیں اوراق گل!!
ہے ازل کا نوشتہ ہمارے لیے
ٹہنیوں پر اگیں
خوب پھولیں پھلیں
زرد موسم کے آتے ہی جھڑنے لگیں
وہ شجر جس پہ ہم نے لیا تھا جنم
اپنے ہاتھوں سے کر دے سپردِ ہوا
ہم ہیں اوراقِ گل یہ ہے اپنی سزا
کچھ بنیں گردِ راہ
کچھ ہوں رزقِ ہوا
خشک بنجر زمیں جو ترستی رہی
آسمانوں سے شبنم برستی رہی
اپنے مدفن پہ جشنِ بہاراں ہوا
راستے وادیاں
یہ فضا یہ سماں
سب ہیں گل پوش اب
ہم خزاں سوختہ
تیری گل پوش وادی میں آ بھی گئے

اس سے کیا فائدہ
وقت کا نوحہ گر تو کہے گا یہی
تم ہو رزقِ ہوا
تم ہو رزقِ ہوا

المیہ

عجب طرح کا یہ المیہ ہے
ہر ایک لحظہ میں زندگی کے
نئے معانی تلاش کرتی
بھٹک رہی ہوں
میں زندگی کو سراب سمجھوں
کہ خواب سمجھوں، حباب سمجھوں
یا اپنی جاں کا عذاب سمجھوں
عجب طرح کا یہ المیہ ہے
جو خواب سمجھوں تو رنگ چاہوں
حباب سمجھوں تو ٹوٹ جاؤں
سراب سمجھوں بھٹکتی جاؤں
عذاب سمجھوں تو سہہ نہ پاؤں
عجب طرح کا یہ المیہ ہے
مجھے تو اس سے نجات دے دے
نیا کوئی انتساب دے دے
مجھے کوئی تو جواب دے دے

بنجر ہوتی آنکھیں

سردی کی ٹھٹھرتی راتوں میں
ہم دھندلی دھندلی آنکھوں سے
کیا منظر دیکھتے رہتے تھے
وہ لمحے کیسے لمحے تھے
جب بنجر ہوتی آنکھوں سے
کچھ تارے ٹوٹ کے گرتے تھے
کچھ سپنے بنتے رہتے تھے
کچھ پیماں جلتے بجھتے تھے
جب چاند پہ بدلی آجاتی ہے
چہروں پر زردی چھا جاتی
پھر ہلکے زرد گلابوں پر
شب اپنا آنچل لہراتی
دم تیز ہوا کا رک جاتا
جب ہجر کی آندھی چلتی تھی
ہر چیز اڑا لے جاتی تھی
یادوں کے بھٹکے طائر بھی
پھر لوٹ کے گھر نہ آتے تھے
وہ برف دنوں کے منظر اب

آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں
دھند اور بھی بڑھتی جاتی ہے
سپنے بھی بوجھل ہوتے ہیں
اب بنجر ہوتی آنکھوں سے
کچھ جلتے آنسو بہتے ہیں
ہم تنہا بیٹھ کے روتے ہیں

آگ ہی آگ

زخم احساس کی اکائی میں
گم ہوئی جا رہی ہے میری ذات
دھند سی چھا رہی ہے آنکھوں پر
مان لی آج میں نے خود سے مات
یہ مرا ظاہری تبسم بھی
ساتھ اب میرا دے نہیں سکتا
آج کی رات کٹ بھی جائے اگر
زندگی کیسے کاٹ پاؤں گی
ٹمٹماتی ہے لو امیدوں کی
آس کے بجھ گئے ہیں سارے چراغ
گردشِ وقت سے کہو جاناں
اک ذرا دیر اور مہلت دے
سانس لے لوں ذرا سنبھل جاؤں
دو گھڑی کے لیے بہل جاؤں
جن سہاروں پہ جی رہی ہوں میں
آگ ہی آگ ہے وہاں جاناں
کوئی لمحہ تو خوشگوار آئے
رخ پلٹ دے جو ان حوادث کا
ایک جھونکا ہوا کا بھیج ذرا
اور اس جاں گداز ساعت میں
کہیں اک گوشہ سکوں دے دے

حدتِ شوق سے سلگتا ہے
میرا سارا وجود جلتا ہے
راستہ بھی نہ اب دکھائی دے
زخمِ احساس کی اکائی سے
آج مجھ کو ذرا رہائی دے

دشتِ فراموش

گردِ ایام میں لپٹے ہوئے جامد چہرے
کُنجِ وحشت میں فروزاں کئی ساکت آنکھیں
رہ گیا جل کے زبوں حال تمناؤں میں
عہد رفتہ کے کسی طاق پہ یادوں کا دیا
سانس رکتی ہے مری دشتِ فراموش میں آج
کیسے جی پاؤں گی اس وقتِ گراں بار میں آج

دشتِ تمازت

اب کہاں مجھ میں سکت رستہ بدلنے کی رہی
اب کہاں مجھ میں سکت ساتھ ترے چلنے کی
حوصلہ پست کیا گردشِ دوراں نے مرا
سوچ پر برف کی تہہ جمتی چلی جاتی ہے
راستہ گردشِ دوراں کا بدلنے کے لیے
میرے برفاب خیالوں کو پگھلنے کے لیے
پھر کسی دشتِ تمازت میں اترنا ہوگا

کشمیر جلتا دیکھ کر

خون کا بہتا دریا دیکھا
ہر سو موت کا پہرا دیکھا
ایک الاؤ بھڑکا دل میں
جب کشمیر کو جلتا دیکھا
سوچ پہ خوف کا پہرا دیکھا
ہر جا خود کو تنہا دیکھا
ماں کا سینہ چھلنی کرتے
دھرتی ماں کا بیٹا دیکھا
مسجد میں منبر کے آگے
مسخ شدہ اک چہرا دیکھا
پھولوں کی جنت میں میں نے
جلتا سرخ سویرا دیکھا
تیز الاؤ بھڑکا دل میں
جب کشمیر کو جلتا دیکھا
وحشی دشمن کے ہاتھوں سے
گلشن صحرا بنتا دیکھا
ٹوٹی ڈالی پر کل میں نے
روتا ایک پرندہ دیکھا
انسانوں کی آبادی میں
شیطانوں کو ٹھہرا دیکھا
راتیں رو رو کاٹی میں نے

جب کشمیر کو جلتا دیکھا
بازی الٹی بکھری دیکھی
بچپن سہما سہما دیکھا
کچے ذہنوں میں نفرت کے
ناسوروں کو پلتا دیکھا
زندہ مردہ لاشیں دیکھیں
اعضا اعضا بکھرا دیکھا
روشنیوں کے شہر میں ہر شب
سناٹوں کا ڈیرا دیکھا
برسوں بعد پلٹ کر آئی
شہر کا شہر ہی بہرا دیکھا
آوازوں کی اس بستی میں
خاموشی کا پہرا دیکھا
ایک الاؤ بھڑکا دل میں
جب کشمیر کو جلتا دیکھا
خون کی ہولی دیکھنے والی
آنکھیں موندیں سپنا دیکھا
چاندنی اوڑھی شب بھر میں نے
چاند نگر کا چہرا دیکھا
کل کشمیر ہمارا ہوگا
میں نے خواب سنہرا دیکھا
سرد الاؤ ہو گئے سارے
جب کشمیر کو اپنا دیکھا

حصارِ خوف

خامشی اوڑھی ہے میں نے اس حصارِ خوف میں
بڑھ رہا ہے میری جانب اک محیطِ بے اماں
نوحہ بھی کیسے پڑھوں ہونٹوں کو میں نے سی لیا
مضطرب ذروں کی صورت اڑ رہی ہوں میں یہاں
رفتہ رفتہ گر رہی ہے میری یہ دیوارِ جاں
زندگی سے دور ہوں اور موت سے بھی دور ہوں
ہے سکوں کی جستجو میں کسقدر مجبور ہوں
جاں لیوا ہو گیا ہے یہ مسلسل اضطراب
سمت کا بھی کچھ تعین کر نہیں پاتی ہوں میں
ایک دلدل منتظر ہے جس طرف جاتی ہوں میں
ہمسفر آؤ اسی دلدل میں رستہ ڈھونڈ لیں
پھر کہیں ایسا نہ ہو ہم ہوں حصارِ خوف ہو
ہم بدل کر بھیس چپکے سے نکل جائیں کہیں
سر بریدہ اک شبیہِ نارسائی کی طرف

ابھی کچھ خواب بننا تھے

مری چنری کے پلو میں مرے دستِ حنائی میں
مہکتی یاد کی کلیوں کے گجرے کس نے باندھے ہیں
خلا کے پار تکتے تکتے بینائی بھی پتھرائی
ابھی کچھ خواب بننا تھے ابھی کچھ اور کہنا تھا
گھٹا ساون کی برسی میرے گھر کے سونے آنگن میں
مری آنکھوں کا کاجل بہہ گیا موسم بدلنے سے
حسیں یادوں کے منظر ایک پل میں ہوگئے جل تھل
ابھی کچھ خواب بننا تھے ابھی کچھ اور کہنا تھا
بہت ظالم ہے برکھا رت دھکتی آگ کے شعلے
برستی گنگناتی شوخ رم جھم سے بجھاتی ہے
مجھے حیران کر دیتی ہے کچھ کہنے نہیں دیتی
ابھی کچھ خواب بننا تھے ابھی کچھ اور کہنا تھا

رکھنا ہے بھرم پنداروں کا

ہنگامِ سحر کی بات نہ کر سب کچھ ہے یہاں زر والوں کا
رودادِ شبِ غم کیسے کہوں رکھنا ہے بھرم پنداروں کا
شعلے ہیں فضاؤں میں رقصاں کلیوں کی گریہ زاری ہے
احساسِ مسرت گرد ہوا اک خوف سا مجھ پر طاری ہے
بے بام و در کے باسی تو سپنوں کے جھروکوں سے اکثر
کبھی برج منارے دیکھتے ہیں کبھی محل دوارے دیکھتے ہیں
سب تلخ حقیقت جانتے ہیں اوقات بھی سب پہچانتے ہیں
خوشیوں پر سب کا حق تو ہے اور حق اپنا سب مانگتے ہیں
دنیا میں دینے والا تو کچھ دیتا ہے کچھ لیتا ہے
جب حصے بٹنے لگتے ہیں تو اکثر ایسا ہوتا ہے
اک پلڑا بھاری ہوتا ہے اک پلڑا ہلکا رہتا ہے
حصے تو بٹتے رہتے ہیں اور غصے بڑھتے رہتے ہیں
ہے کس میں جرات پلڑوں کے اوزان برابر کر ڈالے
بس لاوا پکتا رہتا ہے اور کھیل کھلاڑی کھیلتے ہیں
سب جیت کو اپنا جانتے ہیں اور ہار بری گردانتے ہیں
ایسا بھی کوئی شخص تو ہو جو اس پر تھوڑا غور کرے
بس بازی جیتنے کی خاطر کیوں کھیل کھلاڑی کھیلتے ہیں

گر ہار نہ ہو بس جیت ہی ہو تو کیا؟ ایسا بھی ممکن ہے
سب جیتنے والے لوگوں کو احساس مسرت مل جائے
اس مال و زر کی دنیا میں اس بات کو کسی نے سمجھا ہے
حق چھین کے اپنے ساتھی کا حق اس کو اپنا سمجھا ہے
ہنگامِ سحر بھی ان کا ہے احساسِ مسرت بھی ان کا
یہ دنیا ہے زر والوں کی رکھنا ہے بھرم پنداروں کا

بدلتی رُت کی تلخی

مری بجھتی ہوئی آنکھوں کی خوابیدہ فصیلوں پر
ستارے جگمگاتے ہیں
ابلتے لفظ
دل کو اور ہونٹوں کو جلاتے ہیں
فضا کے ہاتھ زخمی ہیں
بگولے راہ کے
اس کے لیے کنگن بناتے ہیں
حسیں موسم کے سارے ذائقے
میں بھول بیٹھی ہوں
بدلتی رُت کی تلخی
آج تک ہونٹوں پر باقی ہے

اب سورج کو سونے دو

اب آئی ہے نیند مسافر
ڈھلتے دن کے سورج کو
جلتے جلتے تھک سا گیا تھا
چاند کی ٹھنڈی چھاؤں ملی تو
آنکھیں موند کے لیٹ گیا ہے
بھیگی شب سے کہہ دو جاناں
اپنے بھیگے آنچل کو
اسکی پیشانی پر رکھ دے
اور سورج کو سونے دے
صبح سویرے پھر جلنا ہے
اندھوں کی لاٹھی بننا ہے
شبنم میں نہلا کر اسکو
تھوڑا ٹھنڈا ہونے دو
اب سورج کو سونے دو

خالق کی تلاش

اتنا بتا دے کونسا موسم میرا ہے
مجھ کو دکھا دے کونسا منظر میرا ہے
جاننا چاہوں کونسا رنگ ہے میرا رنگ
اس دھرتی کا کونسا امبر میرا ہے
مٹی میری گوندھ کے تو نے
خود مجھ کو تخلیق کیا
لوح پہ لکھا میرا مقدر
عرش سے فرش پہ پھینک دیا
تیری اس دنیا میں کب سے
قریہ قریہ گھوم رہی ہوں
اپنا خالق ڈھونڈ رہی ہوں
جھیل کنارے وادی چپ ہے
دھرتی چپ ہے ساگر چپ ہے
رنگ دھنگ کے کچھ نہ بتائیں
رُت کے پنچھی اڑتے جائیں
بنجر دھرتی سونا اگلے
پوچھوں میں تو کچھ نہ بتائے
چاند کو دیکھوں وہ چھپ جائے
سورج کو جب دوں آواز
کچھ کب بولے جلتا جائے
مانگتے پوچھتے صدیاں گزریں

سوچ رہی ہوں آج میں جاناں
کچھ بھی نہ مانگوں کچھ بھی نہ پوچھوں
آنکھیں اپنی بند کروں
اور
دامن پھیلا دوں
جلدی سے بس اتنا کہہ دوں
تیرے در پہ آہی گئی ہوں
اپنا آپ تو مجھ کو دے دے
میرا سارا جیون لے لے
مجھ کو ساتھ تیرا مل جائے
پھر کیا غم ہے
سارے موسم میرے موسم
سارے رنگ پھر میرے رنگ ہیں

بے آب لہجہ

سنو اک بات میری برق لمحو
میرا بے آب لہجہ بے یقینی کی صدا ہے
مرے لہجے کی تلخی یہ جہانِ کربلا ہے
سنو اک بات میری برق لمحو
یہ کشتِ جاں طلب کچھ کر رہی ہے
اسے تریاقِ جبرو ظلم لا دو
نہ اسکا حوصلہ تم آزماؤ
ندامت ہوگی تم کو آزما کر
مسلسل جبر کی چکی میں پس کر
یہ کشت جان بنجر ہو گئی ہے
اسے تریاق جبرو ظلم لا دو
سنو اک بات میری برق لمحو
بہت روشن ہوئے ہیں چاند تم سے
مرے رستے میں تاریکی بہت ہے
ذخیرہ روشنی کا تم بنے ہو
سرافلاک اڑتے پھر رہے ہو
یہ پرواز جنوں تم کو مبارک

مجھے بس روشنی تھوڑی سی دے دو
سنو اک بات میری برق لمحو
دیئے کچھ اور راہوں میں جلا دو
اندھیروں کا ذرا سا کرب بانٹو
مسافر کی سزا تھوڑی سی کم ہو
اجالوں میں وہ تھوڑی دیر جی لے
اسے تریاق جبر و ظلم لا دو

نامکمل ہے داستان میری

کوئی تو آ کے شبِ ہجر میں پوچھے مجھ سے
کوئی تو بات کرے تلخیٔ غم ہی کم ہو
کوئی دھیمی سی محبت بھری آواز نہیں
مونس غم ہو مری جو مری دمساز بھی ہو
اتنا لکھا ہے کہ ہیں انگلیاں بھی میری فگار
اتنا سوچا ہے کہ اب سوچ بھی باقی نہ رہی
پردۂ فکر پہ ہیں ریت کے طوفاں چھائے
کیسے آگے میں بڑھوں رہتی ہوں اس سوچ میں گم
چشمِ بینا ہے بگولوں میں مقید جاناں
پردہ ذہن پہ بنتی ہوئی تصویریں بھی
اب تو دھندلی سی نظر آتی ہیں مجھ کو جاناں
وہم کے ناگ بھی در آتے ہیں تاریکی میں
اژدھے شک کے بھی پھنکارتے پھرتے ہیں یہاں
کینچلی روز بدل لیتے ہیں افکار مرے
نقش مٹتے نہیں بنتے ہی چلے جاتے ہیں
پھر مری سوچ کے عفریت بھی چنگھاڑتے ہیں
ایسے طوفان میں تنکے کی طرح میرا وجود
ہے ازل کی طرح آمادۂ پیکار ابھی
ان کہے قصے کئی اور ہیں زنبیل میں بھی
زندگی کی کہانی بھی رقم پوری نہیں
گردش وقت نے انمٹ جو نشاں چھوڑے ہیں

اپنے احساس کی بھٹی میں جلاؤں گی اسے
داستاں میری ادھوری ہے ابھی تک جاناں
داستانِ غمِ ہجراں بھی سنانی ہے مجھے
کوئی تمہیدِ روایت تو بنانی ہے مجھے
لاوا جو کھول رہا ہے مرے اندر جاناں
اس کی تصویر کہانی میں دکھانی ہے مجھے
نامکمل ہے ابھی میری کہانی جاناں
وقت سے کہہ دو ذرا دیر ٹھہر جائے یہیں
سونے سے پہلے سنانی ہے کہانی جاناں

زخمی پرندے کی اڑان

گھپ اندھیری سرد سی خاموش سہمی رات میں
آسماں کی وسعتوں میں سرسراہٹ سی ہوئی
پھر کوئی زخمی پرندہ ہے تلاشِ رزق میں
پھر اسے درپیش نیلے پانیوں کا ہے سفر
دشمنِ جاں گھات میں ہیں اسکو تنہا دیکھ کر
تیر ترکش میں سجا لیتے ہیں اڑتا دیکھ کر
زخم خوردہ ننھی جاں کا حوصلہ تو دیکھنا
سامنے اسکے خلائے بیکراں ہے دیکھنا
آدھے پر تو نوچ ڈالے ہیں کسی صیاد نے
حکم ہجرت کا دیا ہے پھر کسی قزاق نے
موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈرتا نہیں
تیر ترکش سے ہیں نکلے وہ مگر گرتا نہیں
غیب کی آواز پر آمادۂ پرواز ہے
اڑ رہا ہے کیسے دیکھو جیسے وہ شہباز ہے
تیر ہیں پیوست کتنے اس کے چھلنی جسم میں
اور وہ زخمی پرندہ ہے تلاشِ رزق میں
کچھ سکوں ساحل پہ ہے طوفاں گزر جانے کے بعد
وہ بھی اترا ہے یہاں پر بال و پر جانے کے بعد
پھر اسے درپیش نیلے پانیوں کا ہے سفر
زادِ رہ بکھرے ہوئے کچے گھڑے اور بال و پر

یادیں

ریت کے ساحل پہ کچے گھر بنانا توڑنا
تتلیوں کے پر ہتھیلی پر سجانا دیکھنا
شام کی دہلیز پر آنچل دھنک رنگ آس کا
ڈوبتے سورج کے سائے میں بکھرتا دیکھنا
دن ڈھلے یونہی کھڑے رہنا گھنے پیڑوں تلے
گھر پلٹتے پنچھیوں کی خیریت کا پوچھنا
مٹھیوں میں جگنوؤں کو بند کر کے دیر تک
جگمگاتی سرخ ہوتی انگلیوں کو دیکھنا
سب حسیں منظر نگاہوں میں چھپا کر رات بھر
نیند کے ساحل پہ چلنا خواب رستے ڈھونڈنا
وقت کی اس دوڑ میں مجھ کو بہت اچھا لگا
برق رفتاری سے تھکنا پیچھے مڑنا دیکھنا
کسقدر تسکین ملتی ہے مجھے اس امر سے
یاد کرنا بیتی باتیں اور گھنٹوں سوچنا

ادبی سفر شہناز مزمل

شاعری

پیامِ نو
جراتِ اظہار
جذب و حروف
عکسِ دیوار پہ تصویر
موم کے سائباں
Ten Poets of Today
ادھورے خواب
غمِ ادراک

عکسِ خیال (شہناز مزمل ایک مکمل تعارف)
اجلا کون میلا کون (کالموں کا انتخاب)
جادۂ عرفان